برطانیہ میں ریاست اور مذہب

آئینی بنیادیں، مذہبی اقلیتیں اور قانون

ربیکا کاٹو، گریس ڈیوی، ڈیوڈ پرفیکٹ

(Rebecca Catto, Grace Davie, David Perfect)

تلخیص:

اس مضمون میں، برطانیہ میں ریاست اور مذہب کے مابین تعلق کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ برطانوی آئین کے نمایاں پہلوؤں کا خلاصہ بیان کرنے کے ساتھ ریاست اور مذہب کے ابھرتے ہوئے تعلق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ عمومی طور پر اور مذہبی اقلیتوں کے اعتبار سے، جن میں مسلمان برطانیہ میں عیسائیوں کے بعد دوسرا بڑا مذہبی گروپ ہیں، کے بعد مذہب سے متعلق برطانوی قوانین پر بحث کی گئی ہے۔ خلاصہ کلام میں مرکزی بحث اور اس سے متعلق اختلافات پر بات کی گئی ہے۔

تعارف:

برطانیہ میں ریاست اور مذہب کے مابین تعلق کے بارے میں اس مضمون کا آغاز برطانوی آئین کی وضاحت سے ہوتا ہے اور پھر برطانیہ کے تاریخی تناظر میں، اس کے مختلف علاقوں میں چرچ اور ریاست کے معاملات پر بحث کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ موجودہ (اور کافی حد تک تبدیل شدہ) مذہبی منظرنامے اور ملک میں موجود مذہبی اقلیتی گروہوں کی وضاحت کرتا ہے۔ اس ضمن میں مسلمانوں کو

خصوصی اہمیت دی گئی ہے جو برطانیہ میں عیسائیوں کے بعد سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں۔ اس کے بعد مذہب سے متعلق موجودہ قوانین کے خدوخال پر بات کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختلف تناظرات میں مذہبی پادریوں/اماموں کے تقرر کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ برطانیہ میں ریاست اور مذہب کے مابین تعلقات کو سمجھنے کے لیے اس کا جاننا بہت ضروری ہے۔ مزید یہ کہ یہ اس ملک کی عیسائی روایت اور رفتہ رفتہ اس کے کثیر مذہبی معاشرے میں تبدیل ہونے کا مظہر ہے۔ مستقل طور پر بڑھتی ہوئی لامذہبیت بھی اس ضمن میں ایک اہم موضوع ہے۔ خلاصہ کلام میں بنیادی بحث اور اس سے متعلق اختلاف رائے (جو برطانیہ میں مذہب سے متعلق ہیں) پر بات کی گئی ہے۔ ان تمام مباحث کے بعد سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ مذہب اور ریاست کے مابین پیچیدہ اور مختلف النوع تعلق ہے۔

برطانیہ کا آئین

سلطنت برطانیہ میں چار نمایاں ممالک شامل ہیں: انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ۔ برطانیہ عظمیٰ (Great Britain) میں انگلینڈ، ویلز اور اسکاٹ لینڈ شامل ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی اصطلاح ۱۷۰۷ء میں ایک ہی بادشاہ کے تحت، Act of Union کے ذریعے، انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے لیے پہلی مرتبہ استعمال کی گئی تھی۔ انگلینڈ اور ویلز ۱۵۳۶ء میں ہی انگلینڈ میں عملاً شامل ہو چکے تھے۔

۱۸۰۱ء میں ایک اور Act of Union کے ذریعے، سلطنت برطانیہ میں، برطانیہ عظمیٰ کو آئرلینڈ کے ساتھ شامل کر کے برطانیہ عظمیٰ یا مختصراً UK بنا دیا گیا ہے۔

برطانیہ میں کئی درجوں (Levels) کی حکومت ہے۔ سب سے اونچا قانون ساز ادارہ پارلیمنٹ ہے جس کا اجلاس ویسٹ منسٹر (لندن) میں ہوتا ہے۔ اس کی نمائندگی حاکمِ اعلیٰ کرتا ہے۔ اس کے دو چیمبرز ہیں۔ ایوانِ بالا یعنی ہاؤس آف لارڈز اور ایوانِ زیریں یعنی ہاؤس آف کامنز۔ اس وقت ہاؤس آف لارڈز میں ہونے والی بحثوں میں حصہ لینے کے لیے تقریباً ۷۹۰ ارکان اہل ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر تاحیات ارکان ہیں۔ اگرچہ ان کے ۸۰۰ سے زیادہ جانشین ہیں لیکن ۱۹۹۹ء سے لے کر اب تک صرف ۹۲ افراد ہی ہاؤس آف لارڈز میں بیٹھنے کے اہل ہو سکے ہیں۔ اس ایوان کے لیے انتخاب براہِ راست نہیں ہوتا اگرچہ ۱۹۹۰ء کے اواخر ہی سے ہاؤس آف لارڈز میں اصلاحات کا ایجنڈا، سیاسی جماعتوں کے پیش نظر ہے۔ ہاؤس آف کامنز کے تمام ۶۵۰ ارکان (جس میں شمالی آئرلینڈ کے نمائندے بھی شامل ہیں) براہِ راست منتخب ہوتے ہیں۔

برطانوی پارلیمنٹ کا حصہ رہتے ہوئے، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی اپنی اپنی الگ پارلیمنٹ یا اسمبلی بھی ہے۔ اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ کو ۱۹۹۹ء میں تقریباً تین صدیوں کے وقفے کے بعد بحال کیا گیا تھا جبکہ ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی اسمبلیاں ۱۹۹۸ء میں وجود میں آئیں۔ ان تینوں باڈیز کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ ثانوی اہمیت کے معاملات کی ذمہ دار ہے جس میں تعلیم، تربیت، صحت سماجی خدمات اور مقامی حکومتیں شامل ہیں جبکہ ویسٹ منسٹر میں قائم برطانوی پارلیمنٹ بنیادی اہمیت کے معاملات دیکھتی ہے جیسے دفاع، خارجہ پالیسی اور روزگار۔ ویلز میں بھی اسی ثانوی اور بنیادی اختیارات کا فرق ہے۔ اگرچہ ویلز کی نیشنل اسمبلی (جو کہ ویسٹ منسٹر میں قائم ہے) کو اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ سے زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ ستمبر ۲۰۱۴ء میں ایک رائے شماری کرائی گئی کہ آیا اسکاٹ لینڈ کو ایک خودمختار ملک بن جانا چاہیے یا اسے برطانیہ ہی کا حصہ رہنا چاہیے۔ ۴۵ فیصد لوگوں نے اس کے حق میں اور ۵۵ فیصد نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ یوں اسکاٹ لینڈ برطانیہ ہی کا حصہ رہا۔

باقی کی بحث میں شمالی آئرلینڈ کو شامل نہیں کیا جائے گا اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ برطانیہ عظمیٰ کا حصہ نہیں ہے مزید یہ کہ اس کی اپنی انتہائی پیچیدہ تاریخ ہے۔ نتیجتاً اس کے مخصوص سیاسی اور قانونی حالات ہیں۔ شمالی آئرلینڈ میں مذہب بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن یہاں کی صورت حال برطانیہ عظمیٰ سے بالکل مختلف ہے۔!

ایک طرف انگلینڈ اور ویلز اور دوسری طرف اسکاٹ لینڈ میں بہت سارے نمایاں اختلافات ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کا علاحدہ نظامِ تعلیم ہے۔ نمایاں عدالتی نظام ہے جو ضمناً فوجداری ہے۔ اس کے برعکس انگلینڈ اور ویلز عدالتی فیصلوں کی بنیاد پر مشترکہ عدالتی نظام رکھتے ہیں۔ مذہبی انتظامیہ کے اعتبار سے بھی اہم اختلافات ہیں۔

غلط فہمی سے بچنے کے لیے باقی کے مضمون میں انگلینڈ اور ویلز کی صورت حال پر ہی توجہ مرکوز رکھی جائے گی۔

چرچ اور ریاست

۱۵۳۰ء میں چرچ میں تحریکِ اصلاح (Reformation) سے پہلے، چرچ آف انگلینڈ، روم کے زیرِ نگرانی تھا اور پوپ انگلش چرچ کا سربراہ ہوتا تھا۔ ۱۵۳۴ء میں اختیارِ اعلیٰ کے ایکٹ کے تحت کنگ ہنری VIII نے پوپ کی جگہ چرچ کے ''سربراہِ اعلیٰ'' (Supreme Head) کی جگہ سنبھال لی۔ ۱۵۵۳ء میں کوئین میری I (Mary I) کے دور میں عارضی طور پر روم کی حاکمیت بحال ہوئی لیکن ۱۵۵۸ء میں ملکہ الزبتھ کے تاج سنبھالنے کے بعد یہ ختم ہوگئی جو ۱۵۵۹ء میں چرچ کی حاکمۂ اعلیٰ (Supremre Governor) بن گئی۔ دسمبر ۱۵۵۹ء میں کینٹر بری کے پادریٔ اعلیٰ (Archbishop of Conterbury) کا تقرر ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک ایسا ہی چل رہا ہے کہ یہ پورے انگلینڈ کا سب سے بڑا پادری (اول بشپ) (Primate of all England) ہوتا ہے۔ (اس میں ایک استثنا کنگ چارلس II کے دور میں ۱۶۴۶ء سے ۱۶۶۰ء کے درمیان ہے) اس کی یہ برتر پوزیشن صرف انگلینڈ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اینجلیکن چرچ کا سربراہ بھی اسے ہی سمجھا جاتا ہے اگرچہ یہ ان پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔

اگرچہ چرچ آف انگلینڈ، پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے ہی باقاعدہ قیام پذیر ہوا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے ریاست کے ذریعے شناخت حاصل ہے یا یہ ریاست کا ادارہ ہے جو

وزارتِ مذہبی امور کے تحت کام کرتا ہے۔[۲]

اس کے برعکس مذہبی معاملات کو دیکھنے کے لیے بہت سے حکومتی شعبہ جات موجود ہیں۔ ان میں Department of Communities اور مقامی حکومتیں (DCLG) بھی ایک ہے جو ۲۰۰۶ء میں قائم ہوا۔ اس میں Minister of Faith اور Faith Engagement Team، مذہبی تنظیموں اور حکومت کے درمیان بنیادی رابطہ کار کا کام کرتی ہے۔[۳] وقتاً فوقتاً مختلف معاملات میں اس کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن کچھ بنیادی خصوصیات وہی رہتی ہیں۔ چرچ آف انگلینڈ کا سپریم گورنر اب بھی مختارِ اعلیٰ (Sovereign) ہے اور یہ اس کا رکن بھی ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر یہ مختارِ اعلیٰ ہی تمام بشپ کا تقرر کرتا ہے لیکن عملاً یہ تقرری شاہی نامزد کردہ کمیشن کے ذریعے ہوتی ہے اور وزیر اعظم اس کی منظوری دیتا ہے۔ ۲۰۰۷ء سے یہ ہو رہا ہے کہ وزیر اعظم کو کمیشن کی سفارشات کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء سے پہلے، باقی مذہبی اداروں کے برعکس چرچ آف انگلینڈ اپنے بارے میں خود مختار نہیں تھا۔

دیگر قوانین کی طرح ہر تبدیلی کو پارلیمنٹ ہی متعارف کراتی اور اس کی توثیق کرتی تھی۔ اس میں تبدیلی ۱۹۱۹ء میں آئی جب چرچ اسمبلی جسے ۱۹۶۹ء سے کلیسا کی نمائندہ عمومی مجلس (General Synod) کے نام سے جانا جاتا ہے، قائم کی گئی۔ اس کے قیام کا مقصد تبدیلیوں یا اصلاحات کی سفارش کرنا تھا جنہیں اقدامات (Measures) کہا جاتا تھا، جو اگر منظور ہو جاتے تو ان کی حیثیت پارلیمان کے منظور کردہ قوانین کی ہو جاتی۔ کلیسا کی نمائندہ مجلس کے تین حصے ہیں جنہیں ہاؤسز کہا جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ مرتبے کے عیسائی پادریوں کے لیے (Bishops)، دوسرا مسیحی یا عیسائی چرچ کے عام عملے (Clergy) کے لیے اور تیسرا چرچ سے وابستہ (پادریوں کے علاوہ) عام لوگوں (Laity) کے لیے۔ چرچ کی نمائندہ مجلس کی جانب سے سفارش کردہ اہم تبدیلیوں کو ابھی بھی پارلیمان سے منظور کرانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چرچ آف انگلینڈ کے پادری ۲۰۱۴ء میں پاس شدہ قانون کے

تحت، ایک ہی جنس کی شادی نہیں کرا سکتے اور اسے تبدیل کرانے کے لیے پہلے چرچ کی نمائندہ مجلس قانون پاس کرے گی اور پھر پارلیمان اسے منظور کرے گی۔ ۴ تاہم چرچ کی نمائندہ مجلس، حکومت کی تائید شدہ اور پارلیمان کے ارکان کی اکثریت کی رائے پر مبنی اصلاحات کو بھی روک سکتی ہے۔ اس ضمن میں نومبر ۲۰۱۲ء میں اہم واقعہ ہوا جب خاتون پادری (Bishop) کے تقرر کا معاملہ ہر ایوان میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ آخر کار اسے جولائی ۲۰۱۴ء میں منظور کر دیا گیا۔ ۵

انگریزی چرچ (Anglican Church) سے تعلق رکھنے والے ۲۶ اعلیٰ ترین بشپ ہاؤس آف لارڈز میں بطور روحانی رہنما (Spiritual Lords) اپنی خدمات سرانجام دیتے ہیں، جب تک وہ ریٹائر نہ ہو جائیں، وہ ان اجلاسوں میں باری باری شرکت کرتے ہیں۔ دوسرے مذہبی رہنما بھی ہاؤس آف لارڈز کے رکن بنتے ہیں لیکن وہ اپنی ذاتی یا پیشہ ورانہ صلاحیت کی بنا پر بنتے ہیں نہ کہ اپنے مذہبی مرتبے کی بنا پر۔ ۶ اگرچہ حالیہ عشروں میں ہاؤس آف لارڈز میں ہونے والے بحث مباحثوں میں بشپ اور آرچ بشپ (اعلیٰ سطح کے پادریوں) نے مثبت انداز میں حصہ لیا ۷ اور گرانقدر خیالات پیش کیے جن کا عمومی طور پر خیر مقدم کیا گیا لیکن انہوں نے دوسرے ارکان کی نسبت ووٹنگ میں کم حصہ لیا اور بحیثیت مجموعی وہ کسی معاملے پر شاذ و نادر ہی اثر انداز ہوئے۔ ۸ جون ۲۰۱۳ء میں کسی حد تک استثنائی صورت حال نظر آئی جب پادریوں کی ایک غیر معمولی تعداد (۱۴) نے (ایک ہی جنس کی شادی) پر ہونے والی اہم ترین بحث میں حصہ لینے کے لیے اجلاس میں شرکت کی۔ انہوں نے اپنا ایک گروہ بنا کر تو ووٹنگ نہیں کی تاہم نو پادریوں نے اس بل کو منسوخ کر کے اس میں اصلاحات لانے اور پانچ نے اس کی مخالفت میں ووٹ ڈالا۔ ۹

ویلز بے (Welsby) اس بات پر مصر ہے کہ یہ مفروضہ کہ انگلینڈ کا چرچ، ریاست سے ایک بڑی رقم وصول کرتا ہے، بالکل غلط ہے۔ ۱۰ چرچ کو جو رقم وصول ہوتی ہے وہ صرف مسلح افواج، جیل خانوں یا نیشنل ہیلتھ سروس میں متعین پادریوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے ہوتی ہے یا پھر حکومت

عمارتوں کی دیکھ بھال کے لیے چندہ مہیا کرتی ہے۔ چرچ آف انگلینڈ کا سالانہ بجٹ تقریباً ۱۰۰۰، املین پاؤنڈ ہے جس کا تقریباً دو تہائی مختلف چرچ میں آنے والے عبادت گزاروں سے اکٹھا ہوتا ہے۔ باقی ماندہ رقم اولاً مختلف کاروبار میں لگائے گئے سرمائے سے آتی ہے یا پھر اثاثوں یا جمع کیے ہوئے سرمائے سے۔ ایک معقول رقم تقریباً (۸۰ ملین پاؤنڈ) ملکہ کے ریونیو اور کسٹم پر لگائے گئے ٹیکس سے اکٹھی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں جرمنی کی طرح کیتھولک چرچ یا بڑے پروٹسٹنٹ چرچ کے لیے ٹیکس کی الگ سے وصولی نہیں کی جاتی۔[۱۱] اسی نکتے پر کرینمر (Cranmer) نے بھی زور دیا کہ 'انیسویں صدی کے پہلے نصف سے ہی اس (چرچ آف انگلینڈ) نے ریاست سے کوئی رقم وصول نہیں کی جو کہ اس جیسے دوسرے ادارے وصول کرتے ہیں'۔[۱۲]

موجودہ مذہبی منظر نامہ

۱۸۵۱ء سے لے کر اب تک، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں پہلی مرتبہ مذہب کا خانہ شامل کیا گیا۔ درمیان کے ۱۵۰ سالوں میں مذہبی تنوع میں خاصا اضافہ ہوا ہے خاص طور پر جنگ عظیم دوم کے بعد نوآبادیات اور سابقہ نوآبادریاست سے محنت کشوں کی ہجرت کی وجہ سے۔ ۲۰۰۱ء سے پہلے بہت سی مذہبی تنظیموں خاص طور پر مسلم کونسل آف برطانیہ، بورڈ آف برٹش جیوز (Board of Deputies of British Jews) اور کچھ عیسائی گروہوں کا پُرزور مطالبہ تھا کہ مذہب سے متعلق سوال کو شامل کیا جائے۔ اس میں بہت سارے اہلِ علم اور حکومتی نمائندے بھی ان کے ساتھ تھے۔[۱۳] حکومت اور محکمہ قومی اعداد و شمار بھی ان کے دلائل کے قائل ہو گئے۔ قومی اعداد و شمارہ کا محکمہ (Office for National Statistics) اس نتیجہ پر پہنچا: ''مذہب کے سوال کی بنیادی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ مذہبی اقلیتوں کے درست اعداد و شمار حاصل ہو سکیں اور خدمات کو بہتر طریقے سے پہنچایا جا سکے۔[۱۴] ۲۰۱۱ء کی مردم شماری میں بھی مذہب سے متعلق سوال شامل تھا۔ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۱۱ء دونوں مرتبہ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں سوال مختلف تھا۔ انگلینڈ اور ویلز میں ایک ہی

سوال پوچھا گیا تھا ''آپ کا مذہب کیا ہے؟ آپ کس مذہب، مذہبی فرقے یا مذہبی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں؟'' دوسرا سوال ''کس مذہب، مذہبی فرقے یا مذہبی تنظیم کے عقائد کے مطابق آپ کی پرورش ہوئی ہے؟'' یہ سوال ۲۰۰۱ء میں پوچھے گئے تھے لیکن ۲۰۱۱ء میں صرف پہلا سوال ہی دہرایا گیا تھا۔ ان کے ردِ عمل کے درجے بھی مختلف تھے۔ یہ سوال رضا کارانہ تھا (جبکہ باقی دوسرے تمام سوالات لازمی تھے۔) اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نسبتاً زیادہ لوگوں نے اس سوال کا جواب دیا۔ محض ۷ء۷ فیصد کی قلیل تعداد نے اس سوال کا جواب نہیں دیا جبکہ کچھ دوسرے لازمی سوال بھی، جیسا کہ ویلر (Weller) نے بھی نشاندہی کی ہے کیا، کم تعداد میں جواب دیے گئے۔ ۱۵

اس سوال کی نوعیت اور نتائج دونوں کو ہی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے ۲۰۰۱ء میں برطانیہ میں عیسائیوں کی کثیر تعداد (۷۱ء۹٪) پر حیرت کا اظہار کیا، اس بات پر بحث شروع ہوگئی کہ کیا عیسائیوں کی اتنی بڑی تعداد کا تعلق محض شناخت سے ہے یا عیسائی رسوم و رواج پر عمل کرنے والوں سے۔ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری سے پہلے لادین یا سیکولر گروہوں نے ایک بڑی مہم شروع کی کہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں جن لوگوں نے اپنی شناخت ظاہر کرنے کے لیے ''عیسائی'' چنا تھا انہیں ''کوئی مذہب نہیں'' (No Religion) والا خانہ چننا چاہیے اور اس سوال کے ردِ عمل میں واضح فرق بھی واقع ہوا۔ خود کو عیسائی کہنے والوں کی تعداد میں ۲۰۱۱ء میں ۵۹ فیصد تک کمی واقع ہوگئی جبکہ ''کوئی مذہب نہیں'' کو چُننے والے افراد کی تعداد ۲۰۱۱ء میں ۱۵ سے ۲۶ فیصد تک جا پہنچی۔ مردم شماری میں پوچھے گئے سوال پر تنقید کے باوجود برطانیہ میں مذہبی آبادی کی تعداد معلوم کرنے کے لیے یہی بہترین ذریعہ ہے۔ انگلینڈ، ویلز اور اسکاٹ لینڈ کے مجموعی نتائج کی روشنی میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے اعداد و شمار یہ ہیں: ۱۶

۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۱ء کے دوران میں غیر عیسائی افراد کے تناسب میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ غیر عیسائی آبادی کے مقابلے مسلمان ۵۱ء۹٪ سے بڑھ کر ۵۷ء۶٪ ہو گئے۔ بدھ مذہب اور کوئی مذہب

نہیں (No Religion) والوں کی تعداد میں معمولی اضافہ ہوا جبکہ ہندو، سکھ اور یہودی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد میں کمی آئی۔

اقلیتی مذہبی گروہ

مردم شماری کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ برطانیہ میں مذہبی اور علاقائی آبادیاں آپس میں گڈمڈ ہیں۔ برائرلے (Brierley) کا کہنا ہے کہ ۲۰۱۱ء میں ۹۶٪ ہندو ایشیائی تھے جبکہ ۹۳٪ عیسائی سفید فام، ۹۲٪ یہودی، سفید فام اور ۸۷٪ سکھ بھی ایشیا سے تعلق رکھتے تھے جبکہ محض ۶۸٪ مسلمان اور ۶۰٪ بدھ ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۰ فیصد مسلمان سیاہ فام اور ۸ فیصد سفید فام تھے بلکہ ۳۳ فیصد بدھ سفید فام تھے۔ جبکہ کسی مذہب سے تعلق نہ رکھنے والوں کی غالب اکثریت (۹۳ فیصد) سفید فام تھے۔ علاوہ ازیں عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے سفید فاموں کی تعداد میں ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۱ء کے درمیان ۷۶ فیصد سے ۶۵ فیصد تک کمی آئی۔ سوائے براعظم ایشیا سے تعلق رکھنے والوں کے زیادہ تر علاقائی گروہوں میں بھی کمی آئی۔ ۱۷

جیسا کہ اوپر بھی ذکر کیا گیا کہ سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والی مذہبی اقلیت مسلمانوں کی ہے۔ گذشتہ عشرے سے سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت بھی مسلمانوں نے حاصل کی ہے۔ برطانوی مسلمانوں کا تعلق کئی ممالک سے ہے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق براعظم ایشیا، خاص کر پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ موجودہ مسلمان آبادی کا تقریباً نصف برطانیہ ہی میں پیدا ہوا ہے۔ ۱۸ چھاتہ تنظیموں (Umbrella Organizations) کو اس بنا پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرنے میں ناکام رہی ہیں اگرچہ Muslim Council of Britian بسا اوقات نمائندگی کا یہ کردار ادا کرتی رہتی ہے۔ ۱۹

۲۰۰۰ء کے اوائل ہی سے، سرکاری اقدامات جو مذہبی معاملات میں اٹھائے گئے ہیں، نے زیادہ تر سماجی برابری اور انتہا پسندی میں کمی پر زور دیا ہے خاص طور پر امریکہ میں ستمبر ۲۰۱۱ء میں ہونے

والے حملے (۹/۱۱)، جولائی ۲۰۰۵ء میں ہونے والے بم دھماکے (۷/۷) کے ردِعمل میں۔ مثال کے طور پر ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۱ء کے درمیان وہ علاقے جہاں کمیونٹی فنڈنگ سب سے زیادہ تھی، سب کے سب مسلمان آبادی کی اکثریت والے علاقے تھے،[۲۰] دہشت گردی کے خلاف کی گئی قانون سازی نے سب سے زیادہ مسلمانوں کو متاثر کیا ہے جبکہ دوسری جانب لیبر پارٹی کی جانب سے اماموں اور دوسرے مسلمانوں کو بڑی تیزی سے بھرتی کیا جا رہا ہے تاکہ وہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائی جانے والی متنازعہ 'بچاؤ کی حکمتِ عملی' (Prevent Strategy) پر عمل درآمد کرانے میں مدد کریں، 'بچاؤ کی حکمتِ عملی' کو ۷/۷ کے ردِعمل میں لیبر پارٹی نے متعارف کرایا تھا، کنزرویٹو-لبرل ڈیموکریٹ اتحاد نے بھی اس حکمتِ عملی میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اختیار کیا۔[۲۱]

مذہب اور قانون

سینڈ برگ (Sandberg) نے 'مذہب کے قانون' اور مذہبی قانون کے درمیان فرق کیا ہے۔ اوّل الذکر 'بیرونی' قانون ہے جسے مذہبی افراد اور اداروں پر اثر انداز ہونے والے ادارے اور ریاست بناتی ہے جبکہ مؤخر الذکر مذہبی گروہوں کے 'اندرونی' قوانین ہوتے ہیں۔ مذہب کے قانون کے تین اہم پہلو رجسٹریشن اور خیرات کے قوانین، انسانی حقوق کے قوانین اور امتیازی قوانین ہیں۔ بہت سے یورپی ممالک کے برعکس، انگلینڈ میں مذہبی تنظیموں کو بطور مذہب اندراج (Register) کروانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک خیراتی ادارے کے طور پر اپنا اندراج کرا سکتے ہیں۔ چرچ آف انگلینڈ اور چرچ آف اسکاٹ لینڈ کے علاوہ، مذہبی تنظیموں پر خیراتی اداروں یا خیراتی ٹرسٹ کے عام اصول ہی لاگو ہوتے ہیں۔ غیر قائم شدہ چرچ کو رضا کار تنظیموں کے طور پر منظّم کیا جاتا ہے اور ان کی ملکیتی زمینیں، ٹرسٹ (جو کہ عام طور پر رجسٹرڈ کمپنیاں ہوتی ہیں) کے زیرِ انتظام ہوتی ہیں، یہ عام سیکولر قانون کے تحت ہوتا ہے اور ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

یورپی کونسل کے ممبر کے طور پر برطانیہ میں مذہب اور ریاست کے مابین تعلقات پر، انسانی

حقوق کا یورپی کنونشن (ECHR) بہت حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی حقوق کے قانون ۱۹۹۸ء نے پارلیمنٹ کے علاوہ کسی بھی عوامی نمائندے کے لیے اس بات کو غیر قانونی قرار دے دیا کہ وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جو اس کنونشن کے خلاف ہو۔ ECHR کا آرٹیکل ۹ فکر، ضمیر اور مذہب (جس میں تبدیلیٔ مذہب بھی شامل ہے) کی مکمل آزادی عطا کرتا ہے۔ تاہم اپنے مذہب یا عقیدے کا اظہار کرنے کی 'ضروری' حدود ہیں جو کہ آرٹیکل ۹ (۲) میں طے کر دی گئی ہیں۔[۲۲] HRA (Human Rights Act) سے قبل جن مذاہب کو مکمل تحفظ حاصل تھا (نسلی تعلق ایکٹ کے تحت) وہ یہودی اور سکھ تھے، جنہیں ایک نسل گردانا گیا تھا، مگر اب تمام مذاہب کو تحفظ حاصل ہے اور آرٹیکل ۹ کے تحت برطانوی ججوں کے سامنے یہ کیس سنے جا سکتے ہیں۔[۲۳]

روزگار کی یکساں فراہمی (مذہب یا عقیدے) کے قوانین ۲۰۰۳ء میں پہلی مرتبہ مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر روزگار اور ہنرمندانہ تربیت میں امتیاز برتنے کی ممانعت کی گئی۔ ۲۰۰۶ء کے برابری ایکٹ (The Equally Act) نے اس میں سامان اور خدمات کی فراہمی کا بھی اضافہ کیا۔ PSED (Public Service Equality Act) (جو ۲۰۱۱ء سے نافذ العمل ہے) عوامی نمائندوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ امتیاز کو ختم کرنے، برابری کے مواقع فراہم کرنے اور اچھے تعلقات برقرار رکھنے کو خصوصی اہمیت دیں جبکہ مساوات کی سابقہ ذمہ داریوں میں محض جنس، نسل یا معذوری شامل تھی لیکن اب اس میں مذہب یا عقیدے سمیت تمام ذمہ داریاں شامل ہیں۔[۲۴] مساوات یا برابری کے ایکٹ ۲۰۱۰ء میں مذہب یا عقیدے کی بہت کھل کر تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس میں کوئی بھی مذہب، مذہبی یا فلسفیانہ عقیدہ، مذہب کا نہ ہونا یا عقیدے کا نہ ہونا بھی شامل ہے۔

Employment Tribunals کے پاس مذہبی عقیدے کی بنیاد پر آنے والے قانونی کیسوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ۱۴-۲۰۱۳ء کے درمیان اس عدالت نے ۵۸۴ دعووں کو قبول کیا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں صنفی امتیاز کے ۱۳،۷۲۲ دعوے دائر کیے گئے اور ان میں سے بہت کم کے حق میں

فیصلہ ہوا۔ ۲۵ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہم کیسوں کی بہت ہی کم تعداد میڈیا کی توجہ حاصل کر پائی ہے۔ ایسا کم از کم ان کے زیادہ لمبے عرصے تک چلنے کی وجہ سے بھی ہوا ہے۔ ۲۶ نتیجتاً اس علاقے میں کیس کے قانون کی پیروی نے چلن پکڑا ہے۔ اس معاملے میں ایک اہم فیصلہ ایویڈا (Eweida) برخلاف برٹش ایئرویز ہے۔ نادیہ ایویڈا، برٹش ایئرویز کے چیک اِن اسٹاف کی ایک ممبر ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کام کے دوران میں صلیب (Cross) پہنے رکھے جو کہ یونیفارم کے قواعد کی خلاف ورزی تھی۔ بالآخر اس کا فیصلہ جنوری ۲۰۱۳ء میں ECLHR میں ہوا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ اب نجی سطح پر (جبکہ سرکاری سطح پر بھی) یہ خاصا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ کسی فرد کی طرف سے مذہب کے اظہار کی درخواست کو رد کر کے ان کو استعفیٰ دینے کی پیشکش کر دے۔ اب ایسی درخواستوں پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے خواہ وہ ایک فرد کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ عیسائیوں کے بااثر لوگوں نے دعوے دائر کیے ہیں اور وہ کیس ہارے بھی ہیں۔ تاہم ایویڈا، جس کا تعلق قبطی عیسائیوں سے ہے، نے اپنا کیس جیت لیا۔ اس سے کچھ حلقوں میں یہ تأثر قائم ہوا ہے کہ عیسائیت درحقیقت برطانوی معاشرے میں کم اہم ہو کر رہ گئی ہے۔

تعلیم

اسکولوں کی ملکیت اور انتظام

برطانیہ اور ویلز کا تعلیمی نظام بہت پیچیدہ ہے۔ یہ ریاست اور مذہب (چرچ آف انگلینڈ اور بالخصوص رومن کیتھولک چرچ) کے تعلق سے بھی زیادہ پیچیدگی کا حامل ہے۔ حکومتی ادارے کے زیرِ نگرانی شعبۂ تعلیم کے تحت برطانیہ اور ویلز میں چلنے والے اسکول دو طرح کے ہیں۔ ایک جنہیں ریاست مالی امداد مہیا کرتی ہے (Maintained School) دوسرے جو خود مختار ہیں (Independant School)۔ ریاست کے تحت چلنے والے اسکولوں کی آٹھ اقسام ہیں:

کمیونٹی اسکول، فاؤنڈیشن اسکول، رضا کاروں کی مدد سے چلنے والے اسکول (VA)، رضا کاروں کے زیرِ انتظام اسکول (VC)، اکیڈمیاں، مفت اسکول، کمیونٹی کے خاص اسکول اور فاؤنڈیشن کے خاص اسکول۔ ماسوائے کمیونٹی اسکول اور کمیونٹی کے خاص اسکولوں کے دیگر کو مذہبی نوعیت والے اسکول قرار دیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر انہیں Faith School کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ ۳۴ کے تحت ریاستی نظام کے ماتحت آنے سے پہلے زیادہ تر رضا کارانہ اسکول، چرچ اسکول، ہی تھے۔ تاہم ان کو چلانے اور ان کی مالی امداد کا طریقہ کار مختلف تھا۔ ۲۷

مذہبی نوعیت رکھنے والے تقریباً تمام اسکول عیسائی ہیں۔ تاہم اس میں کچھ مستثنیات ہیں: جنوری ۲۰۱۴ء میں ۳۶ پرائمری اور ۱۳ ثانوی اسکول تھے جو یہودی، مسلمان، سکھ یا دوسرے، مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم کے ضمن میں، اختلاف کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ ریاستی نظام میں مذہبی نوعیت رکھنے والے اسکولوں کی جگہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ ایسے اسکولوں کا ایک بڑا مخالف 'اتحادی معاہدہ' (Accord Coalition) ہے جو مذہبی، انسانی اور لادینی تنظیموں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اس اختلاف کے بہت سارے اہم نکات ہیں۔ اس میں یہ بات شامل ہے کہ مذہبی نوعیت رکھنے والے اسکول اونچے طبقے میں شامل ہیں کہ نہیں، وہ معاشرے میں اتحاد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں یا تفریق کا باعث ہیں اور کیا وہ دیگر اسکولوں کی نسبت زیادہ اچھی تعلیم دیتے ہیں۔ اس بارے میں بھی مختلف آراء ہیں کہ ریاست کو انہیں امداد مہیا کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔ ۲۸

برطانیہ اور ویلز میں مذہبی تعلیم

۱۸۷۰ء سے انگلینڈ کا مطالبہ تھا کہ سرکاری مالی امداد سے چلنے والے اسکولوں میں غیر فرقہ پرستی پر مبنی مذہبی تعلیم Religious Education (RE) دی جائے۔ ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ نے مذہبی ہدایات Religious Instruction (RI) کا متفقہ نصاب متعارف کرایا۔ یہ غیر فرقہ پرستی پر مبنی تعلیم کی ایک شکل تھی۔ انگلینڈ میں ہر مقامی تعلیمی اتھارٹی (LEA) کے لیے ضروری تھا کہ وہ

ایک متفقہ نصاب کانفرنس (ASC) تیار کرے اور چار کمیٹیاں اس کے مذہبی نصاب سے متفق ہوں۔۲۹

Religious Instruction بعد ازاں موجودہ مذہبی تعلیم کے نظام کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۸۸ء میں تعلیمی اصلاحات ایکٹ کے تحت یہ طے پایا کہ RE یا مذہبی تعلیم قومی نصاب کا حصہ نہیں ہوگا کیونکہ متفقہ نصاب کانفرنس (ASCS) پہلے سے موجود ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک لازمی مضمون کی رہے گی۔ کمیونٹی اسکولوں میں ASC ہی مذہبی نصاب ترتیب دیتی ہے۔ ان کی نگرانی ایک مقامی ادارہ کرتا ہے جسے (Standing Advisory Council of Religious Education) یا (SACRES) کہتے ہیں۔ یہ اجتماعی عبادت اور مذہبی تعلیم کے متعلق مقامی نمائندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا نصاب ہر پانچ سال کے لیے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ فرقہ پرستی سے پاک ہوتا ہے، جیسا کہ Donald, Bennet اور Leach کا بھی خیال ہے۔۳۰ ان کے مطابق کمیونٹی اسکولوں اور غیر مذہبی اسکولوں میں پڑھایا جانے والا مذہبی نصاب ''عیسائیت پر ہی مبنی ہوتا ہے جبکہ اس میں برطانیہ میں موجود دوسرے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا بھی ایک حد تک خیال رکھا جاتا ہے''۔

رضا کارانہ اور فاؤنڈیشن اسکولوں میں جو مذہبی نوعیت کے ہیں، مذہبی نصاب، ASC ہی طے کرتے ہیں۔ یہ کسی خاص فرقے سے متعلق نہیں ہوتا جب تک کہ والدین یہ درخواست نہ کریں کہ مذہبی نصاب کو اسکول کے خاص عقیدے کے مطابق پڑھایا جائے۔ اس درخواست پر غور کیا جاتا ہے لیکن صرف وہی افراد اس پر غور کرنے کے مجاز ہیں جنہیں گورننگ باڈی منتخب کرے نہ کہ Office for Standards in Education, Children's Services and Skills (OFSTED)۔ عموماً غور کرنے والے افراد اسی خاص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ رضا کارانہ اسکولوں میں، جو مذہبی نوعیت کے ہیں، مذہبی نصاب کو گورنر ترتیب دیتا ہے

جو کہ اسکولوں کے عقیدے کے مطابق ہوتا ہے جب تک کہ والدین مقامی ASC کے ترتیب دیے ہوئے غیر فرقہ پرستی پر مبنی نصاب کا مطالبہ نہ کریں، رضا کارانہ اور فاؤنڈیشن اسکولوں کی طرح، یہاں بھی مذہبی نصاب پر غور گورننگ باڈی ہی کرتی ہے۔ اکیڈمیوں اور مفت اسکولوں کے لیے لازمی ہے کہ وہاں پڑھایا جانے والا مذہبی نصاب مذہب مذہبی گروہ کی تعلیمات کے مطابق ہو۔ مذہبی نوعیت کی اکیڈمیوں اور مفت اسکولوں کو فنڈ مہیا کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ وہاں پڑھائے جانے والے مذہبی نصاب کا معائنہ کرانے کا انتظام کرائیں۔ جبکہ معائنہ کار کو منتخب کرنا ہو تو انہیں متعلقہ مذہبی ادارے سے رجوع کرنا ہوگا۔ غیر مذہبی شناخت رکھنے والی اکیڈمیوں اور مفت اسکولوں کے لیے کمیونٹی اسکولوں والے قوانین ہی لاگو ہوتے ہیں۔ اساتذہ سے مذہبی نصاب پڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ قانون ان سے یہ مطالبہ نہ کرتا ہو۔ یہ قاعدہ عام طور پر مذہبی شناخت رکھنے والے اسکولوں میں لاگو ہوتا ہے۔ والدین کو یہ اجازت ہے کہ آیا وہ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں یا نہیں، اگرچہ طالب علم بذاتِ خود ایسا کرنے یا نہ کرنے کی درخواست نہیں کر سکتے۔

عبادت

۱۹۸۸ء کے تعلیمی اصلاحات ایکٹ کے تحت، سرکاری امداد سے چلنے والے غیر مذہبی اسکولوں کے طالب علموں کے لیے لازمی تھا کہ وہ صبح کے وقت ہونے والی اجتماعی عبادت میں، جو کہ عموماً عیسائی نوعیت ہی کی ہوتی ہے، حصہ لیں، اگرچہ دوسرے مذاہب کے عقائد کو اس عبادت کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔[۳۱]

فاؤنڈیشن اور رضا کار اسکولوں میں، کسی ایک مذہبی گروہ کی صورت میں یہ عبادت کی جا سکتی ہے۔ والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اجتماعی عبادت میں حصہ لینے سے منع کر دیں نیز سولہ سے اٹھارہ سال کے شاگرد بھی عبادت میں حصہ لینے یا نہ لینے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اگر اسکول مذہبی نوعیت کا نہ ہو اور وہاں کے طالب علموں کی بڑی تعداد عیسائیت کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق

رکھتی ہو، تو اسکول اس عقیدے کے مطابق عبادت کروانے کا اہتمام کرسکتا ہے۔

پادریوں کا نظام (Chaplaincies)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ریاست مختلف اداروں مثلاً عبادت، مسلح افواج، قید خانوں اور نیشنل ہیلتھ سروس (NHS) وغیرہ میں مذہبی سرگرمیاں اور خدمات فراہم کرنے والے مذہبی افراد کو رقم فراہم کرتی ہے۔ یہ پادری اعلیٰ تعلیمی اداروں، اسکولوں اور حال ہی میں ایئرپورٹس، شاپنگ سنٹرز، ایمرجنسی سروسز اور کھیلوں میں بھی اپنی خدمات مہیا کرتے ہیں۔ تنخواہ پانے والے بہت سے پادریوں کو چرچ آف انگلینڈ تنخواہ دیتا ہے، بعض دوسروں کو کوئی اور مذہبی گروہ یا فرقہ اور وہ تنظیم یا ادارہ، جہاں وہ کام کررہے ہیں، مل کر یا وہ ادارہ ہی تنخواہ دیتا ہے۔ ۳۲ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں تقریباً ۴۵۰ مسلمان امام ہیں جن میں جزوقتی اور رضا کار امام بھی شامل ہیں۔ ۳۳

حاصلِ بحث اور قابلِ اختلاف امور

اس مضمون میں اکیسویں صدی میں برطانیہ پر اثر انداز ہونے والے چند اہم مسائل جو مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں، سے بحث کی گئی ہے۔ سماجی بحث میں مذہب اب مرکزی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے جبکہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں ایسا نہیں تھا۔ اس سے قدیم اختلافات پھر سے ابھر کر سامنے آئے ہیں اور نئے اختلافات نے جنم دیا ہے۔

ایک اور مستقل بحث، مردم شماری اور شماریات کے دوسرے ذرائع سے سامنے آنے والے اعداد و شمار ہیں جن سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آیا برطانیہ اب بھی ایک عیسائی ملک ہے، جیسا کہ یہ ماضی میں واضح طور پر تھا یا یہ اب لادین ریاست (Secular State) بن چکا ہے۔ جبکہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ مبہم ہے۔ ویلز کے بہت زیادہ حوالہ دیے جانے والے بیان میں یہ ابہام واضح ہے: برطانیہ بیک وقت ''عیسائی، لادین اور مذہبی کثرت رکھنے والا ملک ہے''۔ ۳۴ مزید برآں ویلز

(Weller) کا خیال ہے کہ ''رواں صدی کے پہلے عشرے میں، برطانیہ زیادہ لادین (Secular)، کم عیسائی اور مذہبی طور پر زیادہ کثرت رکھنے والا ملک بن گیا ہے''۔[۳۵]

برطانوی معاشرے میں مذہبی اقلیتوں کی حیثیت پر بھی بہت بحث ہوتی ہے اگرچہ (Nye) اور (Weller) کا خیال ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، لیکن ایک مرتبہ پھر یہاں بھی بحث کی نوعیت تبدیل ہو چکی ہے۔[۳۶] اصلاحِ مذہب کی تحریک (Reformation) کے بعد، کئی صدیوں تک رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والوں کو خطرناک 'دوسرے' (Other) قرار دیا جاتا رہا، ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے عشرے تک یہ جگہ نئی مذہبی تحریکات (New Religious Movement) نے لے لی۔ اب یہ کردار مسلمان پُر کر چکے ہیں۔

نئے نئے اختلافات سامنے آ رہے ہیں، جو کہ ہو سکتا ہے کہ پہلے سے زیادہ یا کم اہم ہو کر سامنے آئیں۔ ایک ایسا ہی اختلاف یہ دلیل ہے جو بعض حلقوں میں دی جاتی ہے جس کی بنیاد حال ہی میں دیا جانے والا عدالتی فیصلہ ہے: برطانوی معاشرے میں عیسائیوں کی حیثیت تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ ایک اور خدشہ جو نام نہاد افسر شاہی کی جانب سے اٹھایا جا رہا ہے وہ حقوق میں مساوات خاص طور پر صنف کے حوالے سے ہے جو صنفی مساوات کو سب سے اہم اور مذہب یا عقیدے کو سب سے کم اہم گردانتے ہیں۔ یہ خیال ٹرگ (Trigg) کا ہے۔[۳۷] تاہم جانسن (Johnson) اور وینڈر بر ک (Vanderbeck) کا خیال اس کے برعکس ہے۔[۳۸]

یہ تمام بحثیں اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ ملک میں مذہبی ترکیب کے بدلنے سے ریاست اور مذہب کے مابین تعلق بھی مسلسل تبدیل ہو رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود، چرچ آف انگلینڈ اور ریاست کے مابین تعلق اب بھی مضبوط ہے۔ جنگِ عظیم دوم سے برطانیہ میں مذہب سے متعلق اپنی یادداشتوں میں وُڈ ہیڈ (Wood head) نے بڑے واضح انداز میں لکھا ہے۔ ''برطانیہ میں مذہب اب وہ نہیں ہے جو کبھی ہوا کرتا تھا''۔[۳۹] اس بات کا بہت زیادہ امکان موجود ہے کہ آئندہ

آنے والے پچاس برسوں میں ریاست اور مذہب کے مابین تعلق نئے انداز میں جنم لیں، نئے اختلافات اُبھریں، اور کئی اختلافات دوسری شکل اختیار کر لیں جو اس ملک میں ریاست اور مذہب کے تعلق کے عملی، جزوی اور مربوط مزاج کو ظاہر کرتے ہوں۔

ترجمہ: اعزاز باقر

.....حواشی.....

1. Claire Mitchell, *Religion, Identity and Politics in Northern Ireland* (London: Ashgate, 2006).

2. Paul A. Welsby, *How the Church of England Works* (London: CIO Publishing, 1985), p. 45.

3. Warwick Hawkins, "Faith in Government: The Work of the Faith Engagement Team" *Public Spirit,* (October 7, 2013), accessed April 19, 2015 from http://www.publicspirit.org.uk/faith-in-government/.

4. Equality and Human Rights Commission, "The Marriage (Same Sex Couples) Act 2013: The Equality and Human Rights Implications for Marriage and the Law in England and Wales", (2014), accessed April 19, 2015 from http://www.equalityhumanrights.com/publication/marriage-same-sex-couples-act-2013-marriage-and-law.

5. Grace Davie, *Religion in Britain: A Persistent Paradox* (Oxford: Wiley Blackwell, 2015), p. 127.

6. Paul Weller, Kingsley Purdam, Nazila Ghanea and Sariya Cheruvallil-Contractor, *Religion or Belief, Discrimination and Equality* (London: Bloomsbury, 2013), p. 32.

7. Davie, *Religion in Britain: A Persistent Paradox,* p. 96.

8. Andrew Partington and Paul Bickley, *Coming Off the Bench: The Past, Present and Future of Religious Representation in the House of Lords (London:* Theos, 2007).

9. Davie, *Religion in Britain: A Persistent Paradox,* p. 96; 109 note 9.

10. Welsby, *How the Church of England Works,* p. 63.

11. Weller et al, *Religion or Belief, Discrimination and Equality,* p. 32. For a summary of the funding of the Church of England, see https://www.churchof england.org/about-us/funding.aspx.

12. Frank Cranmer, John Lucas and Bob Morris, *Church and State: A Mapping Exercise* (London: University College London Constitution Unit, 2006), p. 6.

13. Weller et al, *Religion or Belief,* Discrimination and Equality, p. 35.

14. Joanna R. Southworth, "Religion' in the 2001 Census for England and Wales", *Population, Space and Place,* 11, 2, (March, 2005), pp. 75-88, p. 83.

15. Tweller et al, *Religion or Belief, Discrimination and Equality,* pp. 35-37.

16. Source: National Statistics website: www.statistics.gov.uk Crown copyright material is reproduced with the permission of the Controller of HMSO.

17. Brierley, *UK Church Statistics 2:2010-*2020, p. S14.3.

18. Davie, *Religion in Britain: A Persistent Paradox,* p. 61.

19. Therese O'Toole, Daniel Nilsson DeHanas, Tariq Modood, Nasar Meer and Stephen Jones, *Taking Part: Muslim Participation in Contemporary Governance* (Bristol: Centre for the Study of Ethnicity and Citizenship, University of Bristol, 2013), accessed April 19, 2015 from http://www.bristol.ac.uk/ethnicity/projects/muslimparticipation/.

20. Matthew Francis and Amanda van Eck Duymaer van Twist, "Religious Literacy, Radicalization and Extremism", Adam Dinham and Matthew Francis (eds.), *Religious Literacy in Policy and Practice* (Bristol: Policy Press, 2015), pp. 113-134, p. 128.

21. Francis and van Eck Duymaer van Twist, "Religious Literacy, Radicalization and Extremism", pp. 115-117.

22. Sandberg, *Law and Religion,* pp. 82-87.

23. Sandberg, *Law and Religion,* p. 32; Weller at al, *Religion or Belief, Discrimination and Equality,* pp. 42-43.

24. Weller at al, *Religion or Belief, Descrimination and Equality,* pp. 43-56; Lucy Vickers, "Promoting Equality or Fostering Resentment? The Public Sector Equality Duty and Religion or Belief", Legal Studies, 31, 1, (January, 2011), pp. 135-158.

25. Rebecca Catto and David Perfect, "Religious Literacy, Equalities and Human Rights", Adam Dinham and Mathew Francis (eds.), *Religious Literacy in Policy and Practice* (Bristol: Policy Press, 2015), pp. 135-163, p. 137.

26. Six Such Cases are dicussed in Catto and Perfect, "Religious Literacy, Equalities and Human Rights."

27. Sandberg, *Law and Religion,* p. 152.

28. Oldfield et al. *More Than an Educated Guess: Assessing the Evidence on Faith Schools;* Accord Coalition "Databank of Independent Evidence on Faith Schools", (December 2014), accessed April 19, 2015, http://accordcoalition.

org.uk/wp-content/uploads/2013/12/Databank-of-Independent-Evidence-on-Faith-Schoois-April-2014.pdf.

29. Adam Dinham and Robert Jackson, "Religion, Welfare and Education" Linda Woodhead and Rebecca Catto (eds.), *Religion and Change in Modem Britain* (London: Routledge, 2012), pp. 272-294, pp. 280-281.

30. Alice Donald, Karen Bennett and Philip Leach, *Religion or Belief, Equality and Human Rights in England and Wales.* Equality and Human Rights Commission Research Report no. 84 (Manchester: Equality and Human Rights Commission, 2012), accessed April 19, 2015, http://www.equalityhumanrights.com/publication/research-report-84-religion-or-belief-equality-and-human-rights-england-and-wdles, p. 169.

31. David McClean, "State and Church in the United Kingdom", Gerhard Robbers (ed.), *State and Church in the European Union* (Baden-Baden: Nomos Verlagsgesellschaft, 1996), pp. 307-322, p. 316.

32. Jeremy Clines with Sophie Gilliat-Ray 2015 "Religious Literacy and Chaplaincy", Adam Dinham and Matthew Francis (eds.), *Religious Literacy in Policy and Practice* (Bristol: Policy Press, 2015), pp. 237-256, pp. 238-239.

33. Clines with Gilliat-Ray, "Religious Literacy and Chaplaincy", p. 243.

34. Paul Weller, *Time for a Change: Reconfiguring Religion, State and Society* (London: T&T Clark, 2005), p. 73.

35. Weller et al, *Religion or Belief, Discrimination and Equality,* p. 38.

36. Malory Nye and Paul Weller, "Controversies as a Lens on Change", Linda Woodhead and Rebecca Catto (eds.), *Religion and Change in Modern Britain* (London: Routledge, 2012), pp. 34-54.

37. Roger Trigg, *Equality, Freedom and Religion* (Oxford: Oxford University Press, 2012).

38. Paul Johnson and Robert M. Vanderbeck, *Law, Religion and Homosexuality* (Abingdon: Routledge, 2014).

39. Linda Woodhead, "Introduction", Linda Woodhead and Rebecca Catto (eds.), *Religion and Change in Modern Britain* (London: Routledge, 2012), p.1.